شاہ ولی اللہؒ کے اصولِ تفسیر

تیسری قسط

مشکلات القرآن

۲۔ ناسخ و منسوخ

تفسیر میں بڑی مشکل ناسخ و منسوخ کی بحث سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس مشکل کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ناسخ و منسوخ کی اصطلاح کی تعریف کے بارے میں متقدین اور متاخرین کے درمیان اختلاف ہے۔ صحابہ و تابعین اس کو فنی معنوں کے بجائے، معروف لغوی معنوں میں استعمال کرتے ہیں، یعنی کسی بھی شے کا ازالہ دوسری شے سے۔ مثلاً کسی آیت پر عمل کی مدت ختم ہونے کا اعلان، کسی عام بات کے مخصوص پہلو کا بیان، یا کسی جاہلی رسم و رواج، یا سابقہ شریعتوں کے کسی حکم کی تنسیخ۔ اس طرح نسخ اور اس کے بارے میں اختلاف کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا، یہاں تک کہ منسوخ آیات کی تعداد ۵۰۰ کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ مگر متاخرین کی اصطلاح کے لحاظ سے یہ تعداد بہت تھوڑی ہے۔ سیوطی نے الاتقان میں علما کی تمام آرا کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد ۲۱ آیات کو منسوخ شمار کیا ہے۔ اس فقیر کے نزدیک، ان آیات پر غور و فکر کیا جائے تو منسوخ آیات کی تعداد ۵ سے زائد نہیں ہے۔

[یہاں شاہ صاحب نے ۲۱ آیات میں ہر آیت کے بارے میں بحث کی ہے]۔

۳۔ شانِ نزول

اسی طرح ایک بڑی مشکل شان نزول اور اسباب نزول کی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس باب میں مشکل کی اصل وجہ متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ہے۔

ا۔ صحابہ و تابعین کے کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب کسی آیت کے شان نزول بیان کرتے ہوئے 'نزلت فی کذا' کہتے ہیں، تو ان کی مراد مجرد کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوتا جو عہد رسالت میں وقوع پذیر ہوا ہو اور آیت کے نزول کا سبب ہو۔ بلکہ (ا) کبھی وہ ایسا واقعہ یا مسئلہ یا صورت حال

بیان کرتے جس پر آیت صادق آتی ہو یا جس پر اس کا اطلاق ہوتا ہو --- خواہ وہ عہد نبوی ؐ میں پیش آیا ہو یا اس کے بعد اور نزلت فی کذا کہہ دیتے ہیں (حالانکہ وہ پہلے نازل ہو چکی ہوتی تھی)۔ ایسے مواقع پر یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ آیت کی تمام قیود و شرائط کا مذکورہ واقعہ پر اطلاق ہوتا ہو۔

(۲) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صحابہؓ نے حضورؐ کے سامنے کوئی مسئلہ اٹھایا' یا آپ ؐ کے عہد میں کوئی واقعہ پیش آیا' اور آپ نے کسی پہلے سے نازل شدہ آیت سے اس کے بارے میں حکم کا استنباط کرتے ہوئے اسے ان کے سامنے پڑھ دیا۔ صحابہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے بھی نزلت فی کذا کہہ دیتے ہیں۔ اس باب میں اس کی بھی گنجائش تھی کہ کسی نے اس کی تعبیر اس طرح کی کہ آیت دوبارہ نازل ہوئی۔

۲۔ محدثین قرآنی آیات کے شانِ نزول کے ضمن میں کثرت سے ایسی روایات بھی بیان کرتے ہیں جن کا اسباب نزول سے کوئی تعلق نہیں' اور تفسیر کرنے والے کے لیے بالکل ضروری نہیں کہ وہ ان کا ذکر کرے اور ان سے بحث کرے۔ مثلاً:

(۱) کہیں صحابہؓ نے اپنی بحث میں کسی آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے' یا اس کی مثال دی ہے۔

(۲) کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی گفتگو میں کسی آیت سے استشہاد کیا ہے۔

(۳) کہیں کوئی حدیث اپنے مقصد یا مفہوم میں کسی آیت کی مطابق ہے۔

(۴) کہیں آیت کے نزول کا مقام یا وقت متعین ہوتا ہے۔

(۵) کہیں آیت میں مذکور اشخاص کے ناموں کا پتہ چلتا ہے۔

(۶) کہیں کلمہ قرآنی کے تلفظ کا بیان ہے۔

(۷) کہیں آیات اور سورتوں کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔

(۸) کہیں یہ بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے کسی حکم پر کس طرح عمل کیا۔

۳۔ شانِ نزول کے باب میں تفسیر کے لیے صرف دو چیزوں کا جاننا ضروری ہے (۱) وہ قصص و واقعات جن کا آیات میں ذکر کیا گیا ہو اور جن کو جانے بغیر ان آیات کا مقصد و مفہوم سمجھنا آسان نہ ہو۔ (۲) وہ واقعات جن کے بغیر عام معانی کا اطلاق مخصوص صورتوں پر کرنا اور ظاہر معانی سے متبادر معانی سمجھنا مشکل ہو۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ گذشتہ انبیا کے بارے میں بہت کم ہی واقعات صحیح احادیث میں بیان ہوئے ہیں اور وہ لمبے لمبے قصے جن کو مفسرین بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی تفاسیر میں بیان کرتے ہیں'

بالعموم اہلِ کتاب سے منقول ہیں۔ ان کے بارے میں صحیح بخاری میں آیا ہے کہ "اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو، نہ تکذیب"۔

۴۔ بعض صورتوں میں صحابہ و تابعین ایسے واقعات بیان کرتے ہیں جن سے مشرکین اور یہودیوں کے عقائد اور ان کی جاہلیت کی عادات و رسوم واضح ہو جائیں، اور آیت کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ نزلت فی کذا۔ ان کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آیت عقائد و اعمال کی انھی صورتوں کے لیے ہے، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے زمانے کی صورت حال پر آیت کا اطلاق واضح ہو، لیکن یہ آیت اس طرح کے تمام امور کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اقوال و تعبیرات میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے، حالانکہ ان سب کا مقصود ایک ہوتا ہے۔ اسی بات کی طرف حضرت ابوالدرداؓ نے اشارہ کیا ہے کہ "کوئی آدمی فقیہ نہیں ہو سکتا، جب تک وہ ایک آیت کو مختلف معانی اور صورتوں پر محتمل نہ کر سکے"۔

۵۔ قرآن کے اسلوب کا یہ پہلو بھی جاننا ضروری ہے کہ وہ بعض جگہ نیک اور بد لوگوں اور ان کی صفات کا بیان کرتا ہے، مگر اس کے پیش نظر کوئی متعین شخص یا اشخاص نہیں ہوتے، بلکہ وہ ان صفات و اعمال کے عام احکام بیان کرتا ہے، (چنانچہ اس ضمن میں متعین اشخاص کی تلاش یا ذکر بے سود ہے)۔ مثلاً وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۔ الخ، وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرًا، قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ـــــ الخ، وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ـــــ الخ، غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ وغیرہ۔ اسی طرح ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً میں کسی متعین بستی کا ذکر مقصود نہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ایسی صورت میں تمام خصوصیات کسی ایک شخص یا بستی میں پائی جائیں۔ اسی طرح كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ ـــــ الخ سے غرض اجر و ثواب کی زیادتی کی تصویر کشی ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ کوئی ایسا دانہ پایا جائے جس میں یہ صفت مِن و عَن موجود ہو۔

۶۔ بعض مقامات پر کسی شبہ کو رد کیا جاتا ہے، یا کسی سوال کا جواب دیا جاتا ہے:۔ یہاں غرض کلامِ سابق کی وضاحت ہوتی ہے نہ یہ کہ کسی نے بعینہٖ یہی سوال کیا ہو یا یہ شبہ ظاہر کیا ہو۔ صحابہ کرامؓ ایسے مواقع پر سوال و جواب فرض کر کے اسی انداز میں تشریح کرتے ہیں۔ ہم نے جتنا غور کیا ہے پورے کلام کو سیدھا، مربوط اور منظم پایا ہے، جس میں اس بات کا کوئی احتمال نہیں کہ وہ ٹکڑوں میں مختلف اوقات میں نازل ہوا ہو۔

۷۔ بعض صورتوں میں صحابہؓ آیات میں تقدیم و تاخیر کا ذکر کرتے ہیں، مگر ان کی مراد مقام و معانی کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر ہوتی ہے، نہ کہ ترتیب نزول کے لحاظ سے۔ مثلاً حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ کا حکم زکوٰۃ سے پہلے تھا، پھر زکوٰۃ کو اللہ تعالیٰ نے اموال کی پاکیزگی کا ذریعہ بنا دیا۔ اب ظاہر ہے کہ سورۃ توبہ آخری سورتوں میں سے ہے جس میں یہ آیت نازل

ہوئی ، اور زکوٰۃ کا حکم بہت پہلے نازل ہوا۔ مگر حضرت ابن عمرؓ کی مراد یہ ہے کہ ابتدا کے لحاظ سے اجمالی حکم کو تقدم حاصل ہے ، اور تفصیلی حکم پہلے نازل ہونے کے باوجود متاخر ہے ۔

۸۔ محدثین کے نزدیک ، بخاری ، ترمذی اور حاکم کی تفسیری روایات سب سے زیادہ صحیح ہیں ۔ ایک طرف ان روایات سے غرائب القرآن کی شرح کا علم ہوتا ہے ، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسبابِ نزول کے بارے میں اکثر روایات کو آیاتِ قرآنی کے فہم میں کچھ دخل نہیں ، سوائے ان چند روایات کے جو ان تین کتب میں آگئی ہیں ۔ جہاں تک محمد بن اسحاق الکلبی کی ان روایات کا تعلق ہے جن میں انھوں نے ہر آیت کے تحت کوئی قصہ روایت کر دیا ہے ، تو محدثین کے نزدیک یہ صحیح نہیں ، اور ان کی اسناد بھی محل نظر ہیں ۔

۹۔ اس باب میں خلاصہ یہ ہے کہ اسباب نزول کی تمام روایات کے جاننے کو فہم قرآن کے لیے ایک لازمی شرط قرار دینا صریحاً غلط ہے ۔ اور یہ سمجھنا کہ اللہ کی کتاب پر تدبر اس بات پر موقوف ہے کہ ان سب روایات کا احاطہ کیا جائے ، دراصل کتاب اللہ سے اپنا حصہ کھو دینے اور اس کی روح و جوہر کے ادراک سے محرومی کے مترادف ہے ۔

۴۔ دیگر مشکلات

ا۔ توجیہ : بعض مقامات پر کوئی بات بعید از عقل و قیاس دنیا لگتی ہے ، کہیں بظاہر آیت میں تناقض و تعارض محسوس ہوتا ہے ، کہیں آیت کا مدلول سمجھنا مشکل ہوتا ہے ۔ ان مقامات کو حل کرنے کا نام توجیہ ہے ۔

۲۔ بعض مقامات پر کلام ایسی صورتیں اختیار کر لیتا ہے کہ مفہوم کو سمجھنے میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں ۔ مثلاً (۱) کوئی لفظ یا فقرہ حذف کر دیا گیا ہو ۔ (۲) ایک چیز کو دوسری چیز سے بدل دیا گیا ہو ۔ (۳) مُؤَخَّر کو مُقَدَّم یا مقدم کو موخر کر دیا گیا ہو ۔ (۴) متشابہات ، تعریضات اور کنایات استعمال کیے گئے ہوں ۔ (۵) معنوی مطالب کے بیان کے لیے محسوس صورتوں کا استعمال وغیرہ ۔ [شاہ صاحب نے ان تمام مشکلات کو مثالوں سے واضح کیا ہے] ۔

اسلوب القرآن

قرآن مجید عام کتابوں کے اسلوب پر نازل نہیں ہوا کہ ترتیب کے ساتھ ہر موضوع کے لیے الگ الگ باب اور فصلیں ہوں ۔ قرآن ایسے پیغامات و فرامین کا مجموعہ سمجھیے جسے بادشاہ اپنی رعایا کی طرف ان کے احوال و ضروریات کے مطابق بھیجتے ہیں ۔ اسی طرح مالکِ کائنات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بندوں کی ہدایت و ارشاد کے لیے ایک سورۃ کے بعد دوسری سورۃ بھیجتا رہا ۔ عہدِ نبویؐ میں ہر

سورۃ لکھی ہوئی محفوظ تھی ' لیکن ان کا کوئی مدوان مجموعہ موجود نہ تھا۔ یہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں مرتب ہوا۔

صحابہؓ نے سورتوں کو چار قسموں میں تقسیم کر رکھا تھا: (۱) السبع الطوال: سب سے زیادہ طویل سورتیں (۲) المئین: ۱۰۰ یا کچھ زائد آیات پر مشتمل ہیں۔ ۳۔ المثانی: جن کی آیات ۱۰۰ سے کم ہیں۔ ۴۔ المفصل: باقی تمام سورتیں۔

۱۔ اسلوب آغاز: (۱) بعض سورتیں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تسبیح سے شروع ہوتی ہیں۔ (۲) بعض میں سورۃ کے نزول کا مقصد بیان کر دیا جاتا ہے: مثلاً ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ ۳۔ بعض بھیجنے والے اور جس کی طرف بھیجا گیا' ان دونوں کے ذکر سے شروع ہوتی ہیں۔ مثلاً تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ۔ (۴) بعض بلا تمہید و عنوان شروع ہو جاتی ہیں اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ (۵) کیونکہ عربوں کی فصاحت اور زورِ کلام سب سے زیادہ قصائد میں ظاہر ہوتی تھی جو ان کے معروف و قدیم اسلوب کے مطابق تشبیب اور عجیب و اہم واقعات کے ذکر سے شروع ہوتے تھے' اس لیے قرآن میں بھی یہ اسلوب اختیار کیا گیا: وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا، فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا۔ اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ، وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ۔

۲۔ اسلوبِ اختتام: بادشاہوں کی فرامین کی طرح' اللہ تعالیٰ نے بھی سورتوں کو جوامع الکلم' تاکید و وصیت اور تہدید و تبشیر پر ختم کیا ہے۔

۳۔ آیات: اللہ تعالیٰ نے سورتوں کو قصائد کے اشعار کی طرح آیات میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن اشعار اور آیات میں بنیادی فرق ہے۔ اشعار عروض و قوافی کے ان محدود اصطلاحی قواعد کے پابند ہوتے ہیں جو انسانوں نے اپنی اپنی قوموں اور زمانوں کے مزاج کے مطابق مدون کیے ہیں۔ اس کے برعکس ' اگرچہ آیات میں بھی وزن اور قافیہ کا لحاظ ہے' لیکن وہ عملاً انسان کی اصل فطرت و طبیعت کے مطابق ہیں' نہ کہ فنی قواعد کے کہ تابع۔

بات یہ ہے کہ انسان کی فطرتِ سلیمہ وزن و قافیہ کے حسن و جمال سے لذت و حلاوت پاتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ جب کلام کے اجزا ایک دوسرے کے موافق ہوتے ہیں تو مخاطب کے نفس میں لذت پیدا کرتے ہیں' اور ایک کے مثل دوسرے کے انتظار کے لیے شوق۔ جب دونوں کا قافیہ ایک ہو' تو لذت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اشعار سے تلذذ کا سبب بھی انسانی فطرت کے اسی راز میں پوشیدہ ہے' جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے۔ اس بارے میں انسانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

چنانچہ جب اللہ جل شانہ نے چاہا کہ وہ انسان سے جو مٹی سے بنایا گیا ہے اسی کی زبان میں

خطاب کرے، تو اس کی قدرت و رحمت کا تقاضا ہوا کہ وہ اس اجمالی اور فطری حسن و جمال صوتی کی رعایت کرے جو انسانوں کے درمیان مشترک ہے، اور اسے اپنے کلام میں منضبط کر دے، نہ کہ ان قوانین و ضوابط کی جو ذوق و زمانے کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ درحقیقت ان قوانین و ضوابط کی پابندی عجز و جہل کی دلیل ہے، اور اجمالی و فطری حسن کی رعایت جو کسی حال مین بھی فوت نہ ہو، ایک ایسا اعجاز ہے جو انسانی قدرت کی حد سے باہر ہے۔

چنانچہ ہم یہ اہم قاعدہ مُستَنبَط کر سکتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی کتاب حمید کی اکثر سورتوں میں صوتی جاذبیت، اور اس کے جمال و تاثیر کی پوری رعایت رکھی ہے، نہ کہ اشعار کی بحر طویل یا بحر مدید کی۔ اسی طرح اس نے فواصل میں ایک اوسط انسان کی سانس کا اعتبار کیا ہے، نہ کہ فن قافیہ کے قواعد کا۔ یہ مبحث تفصیل کا محتاج ہے، لیکن یہاں اتنا اشارا کافی ہے۔

سانس کا آنا اور جانا ایک امر طبیعی ہے، اس کو کھینچنا یا مختصر کرنا بھی انسان کے اختیار میں ہے۔ اللہ نے جس عام اور اوسط حد کا اعتبار کیا ہے، وہی قرآن کریم میں وزن ہے۔ کہیں طویل ہے، جیسے سورۃ نسا میں، کہیں متوسط ہے، جیسے سورہ اَعراف و اَنعام میں، کہیں قصیر ہے، جیسے سورۃ شعراو دخان میں۔

بعض سورتوں کے صوتی اسلوب میں وزن اور قافیہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ ان کا اسلوب خطیبوں کے خطبوں اور حکیموں کی امثال کے طرز پر ہے۔ بعض میں کسی شے کی رعایت نہیں، بلکہ وہ انسانوں کے درمیان گفتگو کے طرز پر ہیں۔

۴۔ تکرار مضامین: قرآن مجید میں علومِ خمسہ کی جگہ جگہ تکرار کیوں ہے؟ ایک موضوع کو ایک ہی جگہ کیوں بیان نہیں کیا گیا؟

جو کچھ ہم کسی مخاطب سے کہتے ہیں اس کی غرض دو قسم کی ہوتی ہیں: (۱) اس چیز کی تعلیم و تلقین جو وہ جانتا نہ ہو۔ (۲) جو معلوم ہے اس کا استحضار حاصل ہو، دل اور عقل کی تمام قوتیں اس معلوم میں فنا ہو جائیں اور فکر و عمل اس کے رنگ میں رنگ جائیں۔ اس غرض کے لیے تکرار ضروری ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں دونوں اغراض کے لحاظ سے کہیں ایک بار تعلیم پر اکتفا کیا گیا ہے، جیسے احکام کے باب میں، اور کہیں تکرار کی گئی ہے۔ اسی لیے ہم کو کثرت تلاوت کا حکم دیا گیا ہے، صرف فہم و ادراک کافی نہیں۔ لیکن تکرار میں اس بات کی رعایت کی گئی ہے کہ ہر بار عبارت بھی نئی ہو اور اسلوب بھی نیا ہو، تاکہ وہ اکثر لوگوں کے ذہن و عقل میں اتر جائے۔